

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ
الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ
كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ
نہ سورج چاند کو کبڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے
آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک چیز ایک چکر میں
پڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی
انسان اپنے دائرہ سے ترقی کر کے اس کی سرحدیں قدم رکھ سکتا ہے، سفیانہ خوش عقیدگی کے سوار
اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفہ ارتقاء (Evolution) تسلیم بھی کر لیا جائے
تب بھی مخلوقات کی کسی کڑی کا عالم قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور
اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبہ نقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسانِ کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور
مراتبِ قرب کے باوجود الوہیت کے شائبہ سے یکسر بری ہوتا ہے۔

انسانیتِ مہول کا | رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی بزرگی سمجھنے کے لئے یہ کافی
ایک کمال ہے | ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے اس کی جانب سے منصبِ اصلاح
پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم
کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو
بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو فطرتِ انسانی کی
کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغراض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے
ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ هُمْ مِنْهَا آمَنُوا وَاحْسَنَ اللَّهُ مَقَامَهُ فِي مَجْمَعِ الْأُمَمِ
تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے۔ بعثت رسول اس انعام کے لئے سر زمینِ عرب کا انتخاب
اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔

حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کے لئے دعا فرمائی تو انھوں نے بھی اس
اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعائیں فرمایا۔

وَبَشِّرِ الصَّالِحِينَ الَّذِينَ إِذَا أُتُوا بِرُسُلِهِمْ مِنْهُمْ

پھر جب اس دعا مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعا خلیل میں لفظ ”منہم“ کی استہانت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ ”من انفسہم“ سے ذکر کیا گیا ہے لہذا من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جن سے انہیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے، انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریشی میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتدا میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتلادیا گیا تھا۔

يَا بَنِي آدَمَ قُمْ أَتَايْتُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ

يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ مَا يَأْتِيكُمْ فَسَمِعِ

الَّتِي وَاصِلُكُمْ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَخْشَوْنَ

لے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں کہ تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں تو جو تعوی کی راہ اختیار کریں ہاؤنیک سے تو ان پر نہ کوئی خوف دہراں اور نہ کوئی غم۔

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولاد آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثت رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی وعدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوت کے لئے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا، اس کے بعد جب خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس درمیان میں دنیا کی مقرر عمر آخر ہونے لگی، ادھر رسولوں کی مقرر تعداد بھی پوری ہو گئی، اس لئے آخری رسول کو بھیج کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور ساطع عالم لینے کا اعلان کر دیا گیا

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَ

آلَ إِبْرَاهِيمَ وَالْعِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ

اللہ تعالیٰ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان پر

ذریۃ بعضہا من بعض جو ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔

اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدم سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے کوئی رسول ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہوتا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ نصاریٰ کی نظروں میں کچھ مشتبہ تھا اسی کو ذریۃ بعضہا من بعض کہہ کر صاف کر دیا گیا ہے یعنی جب وہ بھی انسانوں ہی کی اولاد تھے تو یقیناً ان کو بھی انسان ہونا چاہئے۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے نسل انسانی پر یہ ایک بدنامدارغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے اس لئے خود رسول اور نوع انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہو لفظ رسول کی تشریح رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لئے خود لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خط فاصل ہیں۔ اسی لئے خدائے تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن کریم نے سب کا افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ سے پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) واما محمد الا رسول — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنکلمات استعمال کئے ہیں۔ وجود کا نقطہ اول۔ حقیقۃ الخفائیق۔ برزخیۃ کبریٰ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے تکرار سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہو گئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا دریافت نہ ہو سکا جتنا کہ لفظ رسول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا، اس کے لوازم

سب کے ذہن نشین تھے، اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے، اس کی شخصیت و احترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی نا سمجھ سے نا سمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اس لئے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہہ دیتا کہ میں حکم الحاکمین، ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں۔ بس اسی ایک نقطہ سے سامعین کے دلوں میں ساری عظمتیں دوڑ لگتی، محبت و توقیر، اطاعت و حکمران کی وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لئے امنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصلہ رہنا چاہئیں۔ اس لئے محبت و اطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جو ہر توحید بھی کفر و شرک کے گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا۔

رسول کی اطاعت | درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا خدا کی اطاعت ہے | ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوار رسول کی محبت و اطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے اس کی اطاعت و محبت خدا ہی کی محبت عطا ہو جاتی ہے اسی لئے فرمایا

من یطع الرسول فقد اطاع الله جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا
یعنی اصل حکمران داری تو خدا کی چاہئے۔ ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت کو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکمران داری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت و محبت کے بغیر، خدا کی محبت و اطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں۔ اور اس طرح یہ اطاعت و محبت کتنی ہی پھلتی چلی جائے مگر اس کا اہل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول و وکیل | مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ رسول خدا نہیں، اس کا اوتار و برہنہ نہیں اور اس کا بیٹا بھی نہیں۔ اب یہ سنئے کہ وہ اس کا وکیل و مختار بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام

دینے کے لئے دو لفظ ہیں۔ (۱) رسول (۲) وکیل — ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لئے ہوتا ہے اپنے لئے نہیں ہوتا، مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول — زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے۔ اسی لئے خصوصیت و جوابدہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اُس امانت کے پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کر لے بلکہ چاہے تو قوانین میں ترمیم و تنسیخ بھی کر ڈالے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے درپہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گولہ بند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے قرآن کریم بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنہیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اُس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے تصور ہو سکتی ہے۔ اب آیات ذیل کو پڑھئے۔

اللہ خالق کلّ شیء دھوعلیٰ انہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ربّ

کلّ شیء وکیل۔ وکیل و کارساز ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت

دکھائی باللہ وکیلا۔ ہے اور سب کے لئے خدا کی ذات کا ساز کا بنی؟

اَلَا تَتَخَذُوْنِیْ مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ”میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل و کارساز مت بناؤ“

قُلْ لَسْتُ عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ۔ ”آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا،

رسول مقرر ہوا ہوں۔

من اهتدی فانما یتدی لنفسه ”جوراء یاب ہوا اپنے فائدہ کے لئے اور جس نے

ومن ضل فانما یصل علیہا وما انا لکرمی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر

علیکم بویل۔ وکیل و مختار مقرر نہیں ہوا کہ جواب دہی میرے سر ہو۔

بلغم ما انزل الیک ”جو آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جا رہا ہے

من ربک۔ وہ آپ پہنچا رہے ہیں۔“

ان علیک الابلاغ۔ آپ کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔

اُبَلِّغُكُمْ رَسَالَاتِ رَبِّی ”میں اپنے پروردگار کے پیغامات تمہارے پاس

پہنچائے دیتا ہوں۔

قُلْ مَا یَكُونُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَہ ”آپ کہہ دیجئے کہ یہ میری طاقت نہیں ہے کہ میں قرآنِ کیم

من تلقاء نفسی اَنْ اتَّبِع ”کو اپنی طرف سے بدل ڈالوں، میرے پاس تو جو حکم

الامایوحی الی۔ آئے اس کا تابعدار ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکامِ الہیہ پہنچا دے اور بس۔

شریعت کے ایک شے اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں کسی کی ہدایت و گمراہی کا بار اس پر نہیں

اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جواب دہ ہے جہاں تک کارخانہ عالم کی ذمہ داری و کار سازی

کا تعلق ہے اس کے ذرہ درہ کی کفالت و وکالت خدا تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا اعلان

بھی کر دیا ہے۔ اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح

کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ

سمجھ لے کہ ہدایت و ضلالت کی جواب دہی اُسے خود براہ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر

مُلانہیں جاسکتا۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدا تعالیٰ کا باتیں کرنا طورِ خالقیت

کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح

دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے بلا واسطہ کلام نہیں کیا کرتے، اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہِ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا بلکہ اس کے لئے کچھ مہتیاں منتخب کر لی ہیں جو اس کی نظر میں اس کے لئے اہل بنائی گئی تھیں پھر ان میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اُس سے باتیں کر لیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنی ہم کلامی کی صورتیں مقرر کر دی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ فِی رُؤْیَا حِجَابٍ ۚ
اور یہاں رسولِ فیوحیؐ کا ذمہ فرشتہ بھیجے پھر وہ خدا کے حکم سے جو اُس کو منظور ہو
مَا يَشَاءُ (الشوریٰ - ۶) اس کا پیغام پہنچا دے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَ الْحَكْمَ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مَنْ رَسُلًا مِنْ يَشَاءُ (آل عمران - ۹) اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔
عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يَظْهَرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنْ ارْتَضَى مِنْ رَسُولٍ -
”وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر ان میں جس رسول کو چاہے پسند کر لیتا ہے۔“ (اور ان میں جو بات بتلانا چاہے بتلا دیتا ہے)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لئے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہم کلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لئے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدا تعالیٰ سے جس طرح چاہیں مشافہتہ کلام کر سکیں اس لئے اُن سے کلام کرنے کی بھی صرف چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ شکم خود ذاتِ پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پس پردہ ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے اس کی

دو صورتیں ہیں ایک یہ نبی خود بشریت سے ملکیت کے قریب آجائے۔ دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریت کے قریب آجائے۔ ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لئے کلام الہی کی شوکت و طاقت رسول کے لئے قابل برداشت ہو جاتی ہے اگر کہیں آسنے سامنے آکر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر برباد ہو جائے۔

رسول اور مصلح | جس طرح کہ رسول وکیل و مختار نہیں ہوتا اسی طرح وہ صرف ایک مصلح و ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے۔ ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت و دسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم و فراست، ہمدردی اور نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح و ریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اختیار و اصطفا کے ماتحت ہوتی ہے، ان کی ہر نشئت برخاست ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک مناسب عمر پر وہ خود انھیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے۔ ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے نہ کوئی عوی کرتا ہے نہ عام انسانوں کے عقائد و اعمال سے کوئی ذمہ دار نہ سرکار رکھتا ہے۔ اس کی دعوت میں کوئی تدبیر، کوئی تہسید نہیں ہوتی، وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اُسے کیا کہنا ہے۔ وہ بالکل خاموش خاموش نظر آتا ہے اور جونہی کہ منصب رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس طرح ہوتا ہے کہ کسی کا خوف و خطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر تفسیر یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ

بھاگ رہے تھے، یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اُسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لئے؟ اُس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے گریہ عزالت نشینی تھی کہ غارِ حرا میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں، کوئی مجمع نہیں، کوئی محفل نہیں، جہاں دنیا کی اصلاح و خبر گیری کے لئے آپ چنچ نہ رہے ہوں، خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسبِ کتنا تکلف و تصنع کی تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دستِ قدرت کا براہِ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے | رسالت ایک قسم کی سفارت ہے، ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں | مگر ہر قابل انسان کے لئے سفیر ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور عواہد پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔

خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر جائیے ان کی زندگیوں کا ورق ورق لوٹ جائیے مگر قرآن و حدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصبِ رسالت کسی رسول کی اتباع و اطاعت کے صلہ میں ملا ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ بوقتِ ضرورت براہِ راست ان کو اس منصب پر نوازا گیا ہے بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتلاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطہ سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کر سکیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما، جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح اور کافروں میں اولِ مسلم بن کر آتے ہیں۔ رسالت سے پہلے بھی ان کو دامنِ شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکاتِ ادیانِ سماویہ میں ناقابلِ برداشت ہیں وہ نبوت و رسالت سے پہلے بھی

ان سے دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک و صاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ریاضت و عبادت اس لئے نہیں ہوتی کہ انھیں رسول بننا ہے بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک و صاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لئے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی یہی زندگی اس کی تصدیق کا بڑا سامان ہو جائے۔ اگر بالفرض رسالت کسب و الکتاب کا ثمرہ ہوتی ہے تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سرد مہری پر ہوتا۔ حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی و ضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہو گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اس کی زیر قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو اور نسخ کا تعلق تھا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت و ریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ "یا تینکم رسل منکم" میں بھی اسی طرف اشارہ نکلتا ہے یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کر کے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حکم مقرر ہو کر آیا کرتا ہے۔

ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جاسکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت و استعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظر حکومت اگر اُسے انتخاب کرنا چاہے تو کر لے۔ اسی طرح رسالت و نبوت کی کیفیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے، نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال، ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اس منصب پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لو کان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر لمبا ظ کمال دیکھا جائے تو عمر میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصب نبوت پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لئے نبی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔

لوعاش ابراہیم نکان ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے
صدیقاً نبیاً۔ تو صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہر استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا، انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آ گیا تھا یہ کہ ان کی عمر وفات نہ کر سکی امت میں ان دو شخصیتوں کے متعلق تو غور زبان نبوت سے تصریح آگئی کہ بلحاظ لیاقت و کمال یہ دونوں منصب نبوت کے قابل تھے جن میں سے حضرت ابراہیمؑ کی تو عمر ہی نے وفات کی۔ حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقریباً نبوت کا زمانہ نہ رہا تھا۔ ان کے علاوہ خدا تعالیٰ ہی کو معلوم کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالم تقدیر میں چونکہ نبوت ہی کا ختم کر دیا ٹھیکہ تھا اس لئے کوئی اس منصب پر نواز نہیں گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا کر رسولوں کی آمد بکا رہی تھی اب یہ کہہ کر خاموش ہو گئی کہ دنیا کا آخری راسخا آچکا اب اس کے بعد کوئی رسول نہیں ہے۔

بہر حال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصب رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریک کا رہو جائیں تو شاید خدمات نبوت کی ادائیگی میں میرے لئے سہولت رہے لیکن منصب نبوت چونکہ براہ راست خدا تعالیٰ کے اصطفا پر موقوف ہے اس لئے ان کو اسی ایک بار گاہ میں یہ درخواست پیش کرنا پڑی۔

واجعل لی وزیرا من اہلی میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنائے
ہارون اخی اشد دہ ازری اودان کے ذریعہ میری مکر مضبوط کراد میرا انص

داشکہ فی امری - شریک کار بنادے -

اگر نبوت اکتسابی ہوتی تو یہاں سفارش کے موقعہ پر ان کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:-

داخی ہارون افصح لسانامنی میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اسی میری

فاجعلہ معی ردی صدقنی انی مرد کے لئے میرے ساتھ کرے وہ میری تصدیق کرے گا

اخاف ان یکن بون - مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں -

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو منظور کر لیا گیا اور ان کو بھی نبی بنا دیا گیا۔ سوچئے

کہ فصاحت و بیان کو نبوت میں کیا دخل ہے۔ اس کے برخلاف جب کوہ طور جاتے ہوئے انھیں ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہاں کوئی درخواست بارگاہ رب العزت میں پیش نہیں فرمائی اور براہ راست خود فرما دیا۔ واخلفنی فی قومی واصلم ولا تتبع سبیل المفسدین۔

ذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خلافت و نبوت میں کتنا فرق ہے خلیفہ نبی خود بھی بنا سکتا ہے مگر نبی کسی کو نہیں بنا سکتا ہاں اس کے لئے دعا کر سکتا ہے چونکہ حضرت علیؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی نسبت حاصل تھی اس لئے گمان ہو سکتا تھا کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں نبوت کی دعا کی اور قبول ہو گئی اسی طرح اگر آپ بھی ان کے لئے دعا فرمائیں تو قبول ہو جائے اسی بنا پر جیسا کہ علمائے حدیث کو معلوم ہے اس سے قبل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں یہ خیال گذرے اور آپ کے دست مبارک دعا کے لئے اٹھ جائیں آپ سے کہہ دیا گیا کہ تم اپنے داماد علیؓ کے لئے جو دعا چاہو مانگ لو مگر ایک نبوت کی دعامت کرنا۔ کیونکہ عالم تقدیر میں یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو بات یہاں طے ہو جاتی ہے وہ پٹا نہیں کرتی۔

یہی صورت شب معراج میں پیش آئی ہے جب تقدیر کو یہ منظور ہوا کہ اب آئندہ سلسلہ تخفیف ختم کیا جائے اور باج نمازیں امت کے لئے ایک واجب العمل دستور ہو جائے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا گیا لا یبدل القول لدی تاکہ بعد میں لا یبدل القول کا آئین آپ کے استجابت دعا میں حائل نہ ہو۔ یہی وجہ

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصرار کے باوجود آپ پھر سفارش کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔
خلاصہ یہ کہ نبوت نہ پہلی انتوں میں کسب کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا
اس لئے دعا و سفارش کا موقعہ بھی تھا اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لئے نبوت کی دعا بھی نہیں
کی جاسکتی ہاں اس کے بجائے خلافت باقی ہے اور وہ تاقیامت جاری رہے گی۔

پھر رسول جس طرح کہ خود بننے نہیں اسی طرح خود بولتے بھی نہیں وہ خداستعالیٰ کے ترجمان ہوتے
ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے وہی بولتے ہیں اور اسی لئے ان کا ہر حکم واجب التعمیل مفترض الطاعت ہوتا ہے۔ ہر
امر میں ان کو حکم و فیصلہ بنانا، ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہو جانا اور اس طرح راضی ہو جانا کہ اس میں تنگدلی
بھی محسوس نہ ہو، مومن کا اولین فرض ہوتا ہے۔ ریفارم میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں وہ اپنے قومی خدشات
کے صلہ میں ریفارم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا حکم صرف اخلاقی حد تک واجب العمل ہوتا ہے اس کے ساتھ
نزاع کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے، اس کو خدائی ترجمانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہماری زندگی
کے صرف ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی معاش جسمانی مبداء و معاد سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ رسول کا
تعلق ہمارے ہر گوشہ حیات سے ہوتا ہے، ریفارم کا کوئی حکم مذہب نہیں کہلاتا۔ رسول کا ہر حکم مذہب کی
بنیاد بن جاتا ہے۔ کسی قوم کا ریفارم و مصلح بننے کے لئے اس کا ہنر بان ہونا شرط نہیں ہے۔ رسول کے لئے
ضروری ہے کہ وہ جس قوم کا رسول ہو اس کا ہنر بان بھی ہو۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا
بلسان قومہ۔

رسول کا ہر علم قطعی ہوتا ہے شک و تردد کا اس میں کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ ریفارم کی ہر ہدایت
زیر احتمال رہ سکتی ہے اسی لئے رسول فلاح و کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ریفارم کا میابی کی ضمانت نہیں لے سکتا۔
رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدت ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے اسی لئے
اس کی ذات ایمان و کفر کا محور ہوتی ہے۔ یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم
ہوتی ہے۔ ہزاروں اخلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت و اخوت کی شکل اختیار کر لیتے
ہیں اور بہت سی جمعیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفت وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں اسی لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو یہ مغالطے پیش نہ آتے اور واضح ہو جاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بعید نہیں ہوتا جیسا کہ عام انسان، اور اتنا قریب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ اوتاروا بن۔ وہ بعید ہو کر اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہوتا ہے اور انتہا درجہ قرب کے باوجود پھر احد و صمد سے حلول و اتحاد کا کوئی علاقہ نہیں رکھتا اس کا نام قرب ولایت نہیں یہ قرب رسالت ہے۔ یہ انسان کے لئے مدارج قرب کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں اگر ان دونوں میں فرق سمجھ لیا جاتا تو ایک محب کی زبان سے جو کبھی اضطراب میں عاشقانہ کلمات نکل جاتے ہیں نہ بھٹکتے اور وہ اپنی تمام لن ترانیوں کی بجائے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے

زلاف حمد و لغت اولی است برخاکِ ادب خفتن

سجودے می تو اں کردن درودے می تو اں گفتن

اسی لئے آسمانی مذاہب نے رسول کی اس درمیانی ہستی کے لئے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظ رسول تھا اور اسی لئے اذانوں میں خطبوں میں نمازوں میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظ رسول ہے۔ آج دنیا رسول کی معرفت کے لئے خود لفظ رسول ناکافی سمجھتی ہے اور اپنی طفل تسلی کے لئے دوسرے عنوانات تراش تراش کر اپنے ذہن میں رسول کی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ رسول کی معرفت تم کو لفظ رسول سے زیادہ صحیح کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔